# تعلیم وتربیت کی اہمیت ، اصول ، اور رہبر معظم انقلاب کے تاکیدی بیانات

محمد حسن جمالی

خلاصہ :

انسانیت کے وجود کے لئے تعلیم اور تربیت سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں ،ان دونوں کے بغیر انسان میں انسانیت کی عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ اللہ تعالی نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ،اسے کمال اور سعادت کی منزل تک پہنچانے کے لئے ان تمام وسائل اور ذرائع کو فراہم کیا جن کی اسے ضرورت تھی ،اسی طرح انسان کی ہدایت کے لئے خداوند متعال نے اپنی لاریب کتاب کو نسخہ ہدایت کے طور پر نازل کی اور رسول ظاہری و باطنی کے ذریعے اس کی ہدایت کا انتظام مکمل کیا ،انبیاء آئے اور انسان کو حقیقی کمال کی طرف راہنمائی کی ، بشر کو دنیا وآخرت کی سعادت کے رازوں اور بھیدوں سے آگاہ کیا اور اسے مفید و مضر کاموں سے آشنا کیا۔ آج پوری دنیا میں انسان طرح طرح کے جرائم ، فسادات اور شیطانی کاموں میں مرتکب ہو رہا ہے تو اس کی بنیادی وجہ اس کا اپنی خداداد خود مختاری کی نعمت سے سوء استفادہ کرنا ہے ۔ تعلیم وتربیت کی اہمیت کے سلسلے میں رہبر معظم انقلاب کا یہ بیان اہمیت کا حامل ہے : ایک درسی کتاب سے انسان کو جو توقع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ درسی کتاب ، بچوں اور نوجوان نسل کے لیے ترغیبات سے بھری ہوئی ہو ، مطلب یہ کہ وہ کتاب ایسی ہو کہ بچوں اور نوجوانوں میں شوق پیدا کر دے۔ کتاب کی تالیف کی روش ، چاہے جس موضوع کی ہو کوئی فرق نہیں ہے ، چاہے ہیومینٹیز (بشریات) کی ہو ، ریاضیات کی ہو ، طبیعیات کی ہو ، ایسی ہونی چاہیے کہ طالب علم میں شوق پیدا کر دے ، ٹیچر کی کیفیت اور اس کے رویہ کا اہم رول ہے لیکن کتاب اس سلسلے میں کافی بڑا کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس مقالہ میں رہبر معظم انقلاب کے بیانات کے تناظر میں تعلیم وتربیت کی اہمیت ، ضرورت ، شرائط اور اصولوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

**کلیدی الفاظ :** تعلیم ، تربیت ، اصول ، شرائط ، رہبر انقلاب

## مفہوم شناسی

### تعلیم:

کا لفظ مادہ علم سے ہے اور یہ باب تفعیل کا مصدر ہے. لفظ علم جاننے کے معنا میں ہے تو لفظ تعلیم کا سادہ معنا ہوگا علم سکھانا، دوسروں کو دانش کی دولت سے مالا مال کرنا۔

### تربیت:

لفظ "تربیت" کا درست مفہوم سمجھنے کے لئے اس کی ریشہ یابی بہت ضروری ہے. جب ہم لغت کی کتب کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں اس لفظ کے تین ریشے دکھائی دیتے ہیں: الف: ربا، یربو زیادہ اور نشو و نما پانے کے معنی میں ہے۔ ب: ربی، یربی پروان چڑھنا اور برتری کے معنی میں ہے۔ ج: رب، یرب اصلاح اور سرپرستی کے معنی میں ہے[۱]۔ مفردات راغب کے بقول "رب" مصدری معنٰی کے لحاظ سے کسی چیز کو حد کمال تک پہنچانے، پرورش اور پروان چڑھانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔[۲]

### اصول:

لغت میں اصل، کسی بھی چیز کی بنیاد، اساس اور جڑ کو کہا جاتا ہے۔ تربیتی اصول سے مراد تربیت کے وہ کلی قواعد و اصول ہیں جو تربیت کے مبانی اور اہداف کا موازنہ کرنے کے نتیجے میں حاصل ہوتے ہیں۔ تمام علوم میں اصل کو ایسے نظریات کی مانند استعمال کیا جاتا ہے جو کہ ضروری اور لازمی جزء ہوں۔ اس بناء پر جب ہم تعلیم و تربیت کے اصولوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو ہمیں چاہئیے کہ ان اصول و قواعد کو بھی بیان کریں جو علمی راہنما کے عنوان سے ہمارے تعلیمی اور تربیتی اقدامات کی رہنمائی کرتے ہیں۔

آیت اللہ شہید مطہری لکھتے ہیں: اگرچہ تعلیم و تربیت کے مباحث کوئی مستقل و الگ علم شمار نہیں ہوتے تھے لیکن وقت گزرنے اور مغربی علوم کی طرف لوگ بیشتر توجہ دینے سے آہستہ آہستہ تعلیم و تربیت کے مباحث مستقل علم بننے کے لئے زمینہ فراہم ہوتا گیا یہاں تک کہ بہت سے لوگوں کے مطابق یہ مباحث ایک مستقل علم کے طور پر زیادہ نمایاں ہونے لگے اگرچہ اس نظریے کے مخالفین بھی موجود ہیں۔ علوم تربیتی کے وجود میں آنے کے ابتدائی دور میں اس علم کو صرف تعلیم و تربیت کا علمی مطالعہ قرار دیتا رہا لیکن ایک مستقل علم بننے کے ساتھ ہی صورت حال یکسر بدل گئی۔ علوم تربیتی کے تعارف کا ایک ایسا مجموعہ سمجھا جاتا ہے جو تربیت کی شرائط، اس کا عمل اور صورت حال کا جائزہ لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر تعلیم و تربیت یا فقط تربیت کو انسانی رویے میں مطلوبہ تبدیلی سے تعبیر کریں تو تعلیم و تربیت کا علم یا علوم تربیتی سے مربوط معارف کا ایک ایسا مجموعہ ہوگا جو تربیت اور رفتار سے مربوط امور کے متعلق تحقیق اور غور و فکر کرتا ہے۔ وہ مذید لکھتے

---

[۱] طلال بن علی متی احمد، مادہ اصول التربیہ الاسلامیہ، مکہ مکرمہ، جامعہ امُ القری، الکلیہ الجامیہ، ۱۴۳۱ھ، ص ۸

[۲] معجم مقاییس اللغۃ، ص ۸۷ ۳، لسان العرب، ج ۲ ص ۱۴۲۰، مجمع البحرین ج ۲، ص ۶۳

ہیں: تعلیم کا لفظ علم سے نکلا ہے اور اس کے معنی دوسرے کو سکھانا ہے۔ تعلیم اعلام سے جدا ہے راغب اصفہانی کی لغت کی کتاب "المفردات" میں ان دونوں کے معانی میں یوں فرق بیان کیا گیا ہے کہ تعلیم کے معنی میں تسلسل اور اثبات پایا جاتا ہے جبکہ اعلام میں صرف خبر پہنچانا مقصود ہوتا ہے جس کے لئے تسلسل اور استمرار شرط نہیں۔ باب تفعیل کی خصوصیات میں سر فہرست تسلسل اور استمرار کا معنی دینا ہے۔

صاحب التحقیق کے بقول لفظ رب کسی چیز کو کمال کی طرف لے جانے، نقائص کو تخلیہ اور تحلیہ کے ذریعے رفع کرنے کے معنی میں ہے[1]۔ شہید مطہری لکھتے ہیں: تربیت انسان کی حقیقی صلاحیتوں کو نکھارنے کا نام ہے۔ایسی صلاحیتیں جو بالقوہ جانداروں میں موجود ہوں انہیں بالفعل پروان چڑھانے کو تربیت کہتے ہیں۔ اس بناء پر تربیت صرف جانداروں سے مخصوص ہے۔[2]

افلاطون نے اگرچہ دانش اور علوم کے بارے میں بہت سارے مباحث کو تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن ڈاکٹر نقیب زادہ کے مطابق (۱۳۷۲، ص ۲۰) اس کے تمام مباحث کا محور تربیت کی بحث ہے کتاب (جمہوریت) میں اس کے تعلیم اور تربیتی نظریے کی ہونے والی وضاحت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس حوالے سے اس کا نظریہ دانش وآگاہی پر استوار ہے[3]۔افلاطون تعلیم اور تربیت کے درمیان فرق کا قائل ہے، اس کے مطابق ان دونوں کے درمیان عام وخاص کی نسبت پائی جاتی ہے یعنی تربیت عام اور تعلیم خاص ہے اس کی نظر میں تربیت سے مراد انسان کی ذاتی استعداد کو شکوفا کرکے مرحلہ قوہ سے مرحلہ فعلیت تک پہنچانے کا نام ہے۔اس رو سے تربیت کا عمدہ ہدف انسان کی برجستہ استعداد کو کشف کرکے اسے معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد بنانا ہے۔

## تعلیم وتربیت کا موضوع

تعلیم وتربیت کا موضوع انسان ہے۔علوم تربیتی کی مذکورہ تعریف کے مطابق لگتا یہ ہے کہ علوم تربیتی کا موضوع تعلیم وتربیت کا عمل یا خود تعلیم وتربیت ہے۔ یعنی علوم تربیتی کے ماہرین تعلیم وتربیت سے متعلق مختلف مسائل اور اس کی مختلف جہتوں کا مطالعہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

## تربیتی علوم میں تحقیق کی روش

علوم تربیتی اور دوسرے علوم کی روش تحقیق میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔البتہ یہاں اس علم کو کس نقطہ نظر اور زاویے سے دیکھا جاتا ہے یہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ مادی نقطہ نظر سے اس علم کے تجربی ہونے پر اصرار کرنے سے روش تحقیق روش تجربی میں ہی منحصر ہو جاتی ہے لیکن فلسفہ تعلیم وتربیت میں مشاہدہ اور تجربے کے طریقہ کار کے علاوہ عقلی (استدلالی) اور فلسفی روش بھی جاری ہوتی ہے۔اسی طرح تاریخ تعلیم وتربیت کی تحقیقات میں روش نقلی وتاریخی کو بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ تعلیم وتربیت کی تاریخ میں تحقیق وہی ہے جو تاریخ کے دوسرے شعبوں میں ہوتی ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ تاریخ تعلیم وتربیت کی تحقیق کے دائرے میں تعلیم وتربیت کا ادارہ اور تربیت کے متعلق نظریات یا ان دونوں کا مجموعہ شامل ہے۔

---

[1] حسن مصطفوی، التحقیق فی کلمات القرآن، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۳۰ق، ج ۴، ص ۲۰

[2] مرتضی مطہری، تعلیم وتربیت در اسلام، تہران: صدرا، ۱۳۷۳ش، ص ۴۳

[3] طوسی، ۱۳۵۴، ص ۲۸-۲۵

## علوم تربیتی اور تربیت میں فرق

شاگرد میں مطلوبہ تبدیلی کے عمل کو تربیت ( تعلیم و تربیت education ) کہتے ہیں جبکہ تربیت سے مربوط امور میں تحقیق کرنا علوم تربیتی ( تعلیم و تربیت کا علم pedagogy ) کہلاتے ہیں۔

تربیت اور اس کے مشابہ مفاہیم:

تربیت کے مفہوم کو تمام جہتوں سے واضح کرنے کے لئے تربیت سے ملتے جلتے مفاہیم سے بھی بحث کرنا بہتر اور مناسب ہے نیز مفہوم تربیت اور مفاہیم کے درمیان پائے جانے والی مماثلت اور اختلافات کو واضح کرنا بھی ضروری ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے تعلیم، تبلیغ اور ادب و اخلاق کے مفاہیم نہایت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔

## قرآن میں مسئلہ علم

قرآن مجید میں مسئلہ شناخت، اس کے ارکان یعنی معلم، عالم اور معلوم سمیت شناخت کے شرائط، ذرائع اور موانع کے بارے میں مفصل گفتگو ہوئی ہے۔ اس کی بہت ساری آیات میں انسان کا معلوم واقع ہونے والے خارجی حقائق کی طرف اشارہ ہوا ہے جیسے آسمان، زمین، فرشتے، وحی، غیب و شہادت، قیامت و برزخ، دین و دنیا، بہشت و جہنم ثواب و عقاب وغیرہ۔ اسی طرح بیشتر آیات میں بت پرستوں کے اوہام و خیالات اور ان کے اہداف کے باطل و غیر واقع ہونے کا واضح الفاظ میں تذکرہ ہوا ہے۔ قوہ حس، عقل اور قلبی شہود کے ذریعے عالم خارج سے انسان کے ہونے والے رابطے اور انسان کی شناخت کا معیار قرآن مجید میں بیان ہونے والے موضوعات میں سرفہرست شامل ہیں۔ کتاب الٰہی نے ارکان شناخت یعنی عالم، معلوم، علم اور معلم کی تصدیق کرنے کے علاوہ اللہ تعالی کو ان کے خالق ہونے کے عنوان سے یاد کیا ہے، اسی طرح قرآن کریم نے اللہ تعالی کو معلم اول و بالذات ہونے کی تصریح کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ وہ اپنی ربوبیت کی تدبیر کے بل بوتے پر عالم اور علم کے درمیان رابطہ برقرار کرنے والا ہے۔

قرآن مجید میں شناخت، اس کے بعض ارکان اور اس سے مربوط مسائل کے بارے میں تفصیل سے گفتگو ہوئی ہے لیکن معلوم کے اصل وجود بماھو موجود کے بارے میں کوئی بحث نہیں ہوئی ہے۔ باالفاظ دیگر قرآن مجید میں عالم خارج کا وجود جو سفسطہ کی نفی کا مترادف ہے مسلم ہے اسی طرح سفسطہ کا بطلان اور واقعی خارجی کا ثبوت، بدیھیات میں سرفہرست ہے جس کے بارے میں نہ فقط کوئی تردید نہیں کر سکتا بلکہ شک کرنے کی صورت میں اسے ثابت کرنے کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ ابن سینا نے اپنی کتاب شفا میں اصل واقعیت کا انکار کرنے والوں کے لئے فکر و استدلال کا راستہ مسدود ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے: سوفسطائیوں کو متالم و متاثر کرنا ہی ان کا تنہا علاج ہے[1] قرآن مجید میں جیسے کائنات کے بارے میں تفصیل سے بحث نہیں ہوئی ہے ویسے ہی ذات اقدس الٰہی کی حقیقت جو خالص و مطلق حق ہے اسے بھی قرآن نے مسلم جانا ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی کی لاریب کتاب میں ذات مقدس پروردگار کے بارے میں ہونے والے مباحث اس کے آسماء حسنی اور صفات علیا سے ہی مربوط ہیں جیسے خدا احد، صمد، سمیع، علیم، ظاہر، باطن، فاطر، خالق، مبدئ

---

[1] الھیات شفا ص ۶۷

،معید، ناظم،مدبر اور مدیر ہے۔ سورہ مبارکہ انعام آیت نمبر ۷۳ میں اللہ تعالی کے مبدئ وخالق ہونے کی تصریح کے ساتھ بعض اسلامی اصولوں کا بھی ذکر ہوا ہے۔ و هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَ يَوْمَ يَقُولُ كُنْ فَيَكُونُ قَوْلُهُ الْحَقُّ وَ لَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ عَالِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ وَ هُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِير [1] وہی وہ ہے جس نے آسمان وزمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور وہ جب بھی کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ چیز ہو جاتی ہے اس کا قول برحق ہے اور جس دن صور پھونکا جائے گا اس دن سارا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہوگا وہ غائب اور حاضر سب کا جاننے والا صاحب حکمت اور ہر شے سے باخبر ہے۔اس آیت میں خلقت کی نسبت حق کی طرف دی گئی ہے یعنی حق تعالی نے انسان کو خلق کیا ہے نیز اس میں خدا کے مبدئ ہونے کی تصریح کرنے کے علاوہ معاد کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے کیونکہ موجود بالحق وہی باہدف موجود ہے چنانچہ موجود بے ہدف عبث ہے۔بنابراین اللہ تعالی نے قرآن مجید کی بعض آیات میں خلقت کے عبث ہونے کی نفی کرنے کے ساتھ معاد کو ثابت بھی کیا ہے جیسے ( أَ فَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَ أَنَّكُمْ إِلَيْنَا لاَ تُرْجَعُونَ ) کیا تمہارا خیال یہ تھا کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹا کر نہیں لائے جاؤگے [2]۔

پس سورہ انعام کی پہلی آیت کا پہلا حصہ، تین اسلامی بنیادی اصولوں یعنی مبداء، معاد اور آسمان وزمین مخلوق ونشانہ الہی ہونے کی طرف اشارہ کررہا ہے۔اسی آیت میں معاد کے بارے میں تصریح بھی ہوئی ہے اور آیت کے آخری حصے میں غیب وشہود کی نسبت اللہ کی جانب دینا اس حقیقت کی نشانی ہے کہ جہان خلقت، غیب وشہود میں تقسیم ہوئی ہے۔

قرآن مجید میں نظام خلقت کے وجود کی تصریح کے علاوہ نظام ہستی میں امور کی تدبیر کرنے والے فرشتوں کے ناموں کا ذکر بھی ہوا ہے جن آیات میں فرشتوں کے وجود کا ذکر ہوا ہے ان میں سے سورہ مبارکہ بقرہ کی آیت نمبر ۳۰۔۳۳ ہیں جن میں فرشتوں سے مشاورت اور گفتگو کرنے سے لیکر انسان کامل کے ذریعے انہیں اسماء کی تعلیم دینے کا مسئلہ تک بیان ہوا ہے: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلاَئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَ تَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ *وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى لْمَلاَئِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هٰؤُلاَءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ* قَالُوا سُبْحَانَكَ لاَعِلْمَ لَنَا إِلاَّ مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ * قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَ لَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ أَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ [3]؛اے رسول اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں اور انہوں نے کہا کہ کیا اسے بنائے گا جو زمین میں فساد برپا کرے اور خونریزی کرے جب کہ ہم تیری تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں تو ارشاد ہوا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو اور خدا نے آدم علیہ السّلام کو تمام اسماء کی تعلیم دی اور پھر ان سب کو ملائکہ کے سامنے پیش کرکے فرمایا کہ ذرا تم ان سب کے نام تو بتاؤ اگر تم اپنے خیالِ استحقاق میں سچے ہو ملائکہ نے عرض کی کہ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے بتایا ہے کہ تو صاحبِ علم بھی ہے اور صاحبِ حکمت بھی،ارشاد

---

[1]، سورہ انعام آیت ۷۳

[2]، سورہ مؤمنون آیت ۱۱۵

[3] سورہ بقرہ، آیت ۳۰۔ ۳۳

ہوا کہ آدم علیہ السّلام اب تم انہیں باخبر کردو. توجب آدم علیہ السّلام نے باخبر کردیا توخدانے فرمایا کہ میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمان وزمین کے غیب کو جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو یا چھپاتے ہو سب کو جانتا ہوں۔ سورہ مبارکہ انبیاء میں فرشتوں کے بارے میں یوں بیان ہوا ہے(وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَداً سُبْحَانَهُ بَلْ عِبَادٌ مُكْرَمُونَ* لاَ يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ[1]؛اور لوگوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنالیا ہے حالانکہ وہ اس امر سے پاک و پاکیزہ ہے بلکہ وہ سب اس کے محترم بندے ہیں ،جو کسی بات پر اس پر سبقت نہیں کرتے ہیں اور اس کے احکام پر برابر عمل کرتے رہتے ہیں۔ اس آیت میں تین اہم نکتے کی طرف اشارہ ہوا ہے:

الف: عبودیت پروردگار کا تذکرہ کرکے کائنات میں فرشتوں کے استقلال کی نفی ہوئی ہے۔

ب: دستور الہی کی آمد سے پہلے فرشتوں کی سبقت کی نفی ہوئی ہے۔

ج: خدا کی جانب سے پہنچے ہوئے دستور کو جاری کرنے میں تاخیر کرنے کی نفی ہوئی ہے۔
پس ان تین صفات ( نفی استقلال، افراط و تفریط میں سلب معصیت ) کو بیان کرنے سے فرشتوں کی بندگی اور عصمت بھی ثابت ہوجاتی ہے۔ بنابریں فرشتے نظام خلقت کی تدبیر کرنے والے تو ضرور ہیں مگر امور ہستی کی تدبیر کرنے میں وہ مستقل نہیں یعنی ایسا نہیں کہ خدا نے نظام تدبیر فرشتوں کے حوالہ کرکے خود کو اس سے مکمل طور پر بے دخل کیا ہو بلکہ کسی بھی شان وحال میں فرشتے تدبیر امور میں مستقل نہیں وہ اللہ کے حکم اور اذن سے ہی نظام کی تدبیر کا کام سرانجام دیتے ہیں وہ ہمیشہ خدا کی اطاعت وفرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں پس سلسلہ منظوم ومنضود درحقیقت خدا کے ہی قبضہ قدرت میں ہے البتہ اس نے بعض فرشتوں کو نظام عالم کی تدبیر کرنے پر مامور کررکھا ہے چنانچہ وہ خدا کی قدرت اور حکم سے نظام کائنات کے امور کو چلاتے ہیں۔
مادی اور الہی فکر کے حامل سارے افراد اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات پر نظم حاکم ہے کیونکہ اگر کوئی اس کا انکار کرے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ کوئی بھی علمی قواعد اور مسائل کو کشف کرنے کی فکر نہیں کرے گا بنابرایں مادی اور الہی فکر رکھنے والے سبھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ کائنات میں محکم نظم کی حکمرانی ہے البتہ مادی گرا کہتے ہیں کہ کائنات میں موجود نظم کو مادہ اور طبیعت نے وجود بخشی ہے جب کہ اس کے مقابلے میں الہی فکر رکھنے والے اس بات کے معتقد ہیں کہ عالم ملک وملکوت پر حاکم نظام کو اللہ نے وجود بخشا ہے اور وہ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے" بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ[2]" خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔

---

[1] سورہ انبیاء، آیت نمبر ۲۶-۲۷
[2] سورہ مائدہ، آیت نمبر ۶۴

مرحوم علامہ طباطبائیؒ تفسیر المیزان میں فرماتے ہیں: تعلیم سے مراد استاد یا معلم اپنے شاگرد کے ذہن کو اس چیز کی طرف ہدایت و رہنمائی کرنا ہے جس کے متعلق علم حاصل کرنا مشکل ہو نا کہ تعلیم کے بغیر اس چیز کا سمجھنا اور ادراک نا ممکن ہو۔ حقیقت میں تعلیم راستے کو آسان بناتی ہے اور منزل کو قریب کرتی ہے نا کہ راستہ ایجاد کرنا اور ہدف بنانا مقصود ہے۔

معلّم تدریس کے دوران مطالب کی اس طرح درجہ بندی اور ترتیب دینے کی کوشش کرتا ہے کہ شاگرد ان مطالب کو آسانی سے سمجھ سکے اور مطالب کی دستہ بندی کرکے ترتیب دینے میں اسے کوئی دقّت اور مشکل بھی پیش نہ آئے، درنتیجہ اس کی عمر اور صلاحیت ضائع نہ ہو اور مطالب کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہ کر بیٹھے۔ علامہ رح ایک اور مفہوم بھی پیش کرتے ہیں جسے دراست (مطالعہ) کہا جاتا ہے اور یہ تعلیم سے خاص ہے۔ علامہ رح اس سے صرف معلومات کی منتقلی مراد لیتے ہیں اور تعلیم کو قطعاً اس سے جدا سمجھتے ہیں۔ لہٰذا تعلیم کی اصطلاح سے جو مفہوم مراد لیا جاتا ہے وہ محض متعلّم کے ذہن میں معلومات پہنچانے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ معلّم کو ایک ایسا منصوبہ سوچنا چاہئیے جس کی مدد سے خود متعلّم حقیقت تک پہنچ سکے اور حقیقت اس پر آشکار و عیاں ہو۔ یہ بات واضح ہو گئی کہ تربیت کا مقبول عام مفہوم انسان کی ذاتی استعداد کو شکوفا کرکے مرحلہ قوہ سے مرحلہ فعلیت تک پہنچانا ہے، جس کا عمدہ ہدف انسان کی برجستہ استعداد کو کشف کرکے اسے معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد بنانا ہے، واضح سی بات ہے کہ اس ہدف تک رسائی انسان کی درست تصویر کشی اور اس کے اوصاف کی شناخت کے بغیر بہت مشکل ہے۔اس اعتبار سے ہم پورے وثوق سے یہ کہسکتے ہیں کہ تربیتی نظام میں انسان کی توصیف سنگ بنیاد کی منزلت پر ہے، کیونکہ تربیتی نظام کے سارے اجزاء یعنی مفاہیم ،اہداف اور اصول و روش خود انسان کے اوضاع و حالات سے مربوط ہوتے ہیں مثلا" انسان کو کونسے مقصد کی جانب راہنمائی کرنی چاہئے ؟اس راستے میں انسان کی حرکت کیسی ہو؟ اسے کن طریقوں سے متحرک رکھنا چاہئے ؟اسے کن کن مراحل اور منازل سے عبور کرنا چاہئے وغیرہ، یہ سب اس چیز سے مربوط ہیں کہ انسان کیسا موجود ہے؟ وہ کس طرح کے وجود کا حامل ہے ؟ یہاں ہم قرآن مجید کی نظر میں انسان کے اوصاف کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔ قرآن کریم کی نظر میں انسان کے اوصاف کی شناسائی کے لئے ہم تحلیلی نگاہ سے انسان سے مربوط مفاہیم کو بیان کریں گے۔ انسان کے حوالے سے گفتگو کرنے میں قرآن مجید نے مخصوص الفاظ اور مفاہیم کا استعمال کیا ہے جن میں غور کرنا بہت ضروری ہے تاکہ انسان کے اوصاف کی درست شناخت حاصل ہو سکے۔ نمونے کے طور پر ہم یہاں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفاء کریں گے:

ا۔ روح

کلمہ روح موجودات عالم میں سے ایک موجود کا نام ہے جو فرشتوں کے ردیف میں ہے، یہ موجودات کی حیات کا منشاء ہے،اس رو سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام مراتب زندگی (نباتی، حیوانی، انسانی) میں زندگی اور روح کے درمیان جب تعلق برقرار ہوتا ہے تو حیات ظہور و بروز کرتی ہے، البتہ روح کیا ہے اور کس طرح یہ کسی موجود میں حیات ظاہر ہونے کا سبب بنتی ہے ؟ اسے قرآن نے بیان نہیں کیا ہے اور بشر کو

اس وادی میں داخل ہونے سے روکا گیا ہے۔اس سے متعلق قرآن میں فقط اتنا اشارہ ہوا ہے کہ جب کسی شئی کو تشکیل دینے والے مواد پیچیدگی کے درجے پر پہنچتے ہیں تو اس شئی میں روح کا جلوہ نمودار ہوتا ہے در نتیجہ ان میں زندگی کے آثار آشکار ہو جاتے ہیں۔

انسان شناسی کی سطح پر دیکھا جائے تو روح، آدم کی اولاد میں حیات انسانی ایجاد کرتی ہے، اس حوالے سے انسانوں میں کوئی فرق نہیں البتہ کمیت اور کیفیت کا اختلاف ضرور ہے۔انسان کی روح جس قدر مقدس اور پاکیزہ ہو گئی اسی حساب سے انسان میں انسانیت کا سرمایہ زیادہ ہوگا۔اس کا برعکس اگر انسان کی روح پلید ہو جائے یا اس میں پاکیزگی اور پلیدگی کی آمیزش ہو جائے تو انسان میں انسانیت کا فقدان یا کمی لازمی ہوگی۔انسانی روح کا تقدس ایمان باللہ سے جڑا ہوا ہے لہذا خدا، انبیاء، ائمہ اور معاد پر انسان کا جتنا ایمان مضبوط ہوگا اتنا ہی اس کی روح تقدس سے سرشار ہوگی اور ایسی پاکیزہ روح انسان کو حیات طیبہ سے مالا مال کرتی ہے۔یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کا ایمان مضبوط کب ہوتا ہے؟ جواب واضح ہے انسان کا ایمان کامل اور مضبوط تب ہوگا جب وہ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ تربیت یافتہ بھی ہو۔

## ۲۔ نفس

یہ کلمہ متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے جن میں سے ایک انسان کی روح ہے یعنی انسانی روح پر اس کلمے کا اطلاق ہوا ہے جس کی علت یہ ہے کہ انسان کی انسانیت کو مشخص کرنے والی چیز علم، حیات اور قدرت ہے اور ان تینوں کو جو چیز قوام بخشتی ہے وہ روح ہے۔یہاں یہ نکتہ بھی حائز اہمیت ہے کہ نفس انسانی کے مختلف حالات ہیں قرآن مجید کی کئی جگہوں پر ان کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

## ۳۔ فطرت

کلمہ فطرت مادہ فطر سے ہے جس کا معنا شگاف اور شق کرنا ہے اور کلمہ تفطر و انفطار شق ہونے کے معنی میں ہیں[1]، جب انسان عدم کا سیاہ پردہ چاک کرکے وجود امکانی کی وادی میں آتا ہے تو یہ خلقت انسانی تاریک پردہ چاک کرنے کی مانند ہے۔کلمہ فطرت فعلہ کے وزن پر ہے جو ایک خاص نوع کی خلقت پر دلالت کرتا ہے یعنی آفرینش وابداع بے سابقہ[2]۔یہ کلمہ انسانی خلقت کے بارے میں استعمال ہونے والا اہم کلمہ ہے اور قرآن مجید میں کلمہ فطر کے مشتقات مختلف صورتوں میں استعمال ہوئے ہیں لیکن کلمہ فطرت فقط ایک ہی معنا میں استعمال ہوا ہے یعنی سرشت خاص، انسان کی مخصوص خلقت و امور فطری۔پس فطرت سے مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں نوع خلقت انسان اقتضا کرتی ہے جو سارے انسان میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔فطری امور کی خصوصیت یہ ہے کہ اولا" وہ انسان کی خلقت وآفرینش کا مقتضا ہے اکتسابی نہیں۔ثانیا" وہ سارے افراد میں موجود ہوتے ہیں۔ثالثا" وہ تحول پزیر نہیں ہوتے گرچہ وہ شدت وضعف کو قبول کرتے ہیں۔توجہ رہے کہ قرآن مجید میں بیان ہونے والی فطرت منطق و فلسفہ میں بحث ہونے والے فطریات و امور فطری کے علاوہ ہے، اسی طرح خلقت خاص کے معنا میں جو فطرت ہے وہ طبیعت کا غیر ہے کیونکہ طبیعت تمام موجودات جامد، نامی اور روح حیوانی میں پائی جاتی ہے، البتہ طبیعت اس غریزہ سے جدا ہے جو تمام حیوانات اور انسان کے حیوانی پہلو میں پائی جاتی ہے۔اس بناء پر فطرت اور اس کے معادل الفاظ معرفت کی ایک

---

[1]) راغب اصفہانی، مادہ ف ط ر

[2]) ابن اثیر، الفطر: الابتداء والاختراع۔النھایہ ج ۳ ص ۴۵۷

معین نوع کی حکایت کرتے ہیں یعنی (معرفت ربوبی) اس بنیاد یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان بے رنگ نہیں بلکہ اس کا گوہر وجود، الٰہی رنگ سے رنگین ہے۔قرآن کریم کی نظر میں انسانوں میں پائے جانے والی مشترکہ اصل یعنی فطرت تین خصوصیات کی حامل ہے:

۱۔ وہ اللہ کو جانتی، پہچانتی اور اسے چاہتی ہے۔

۲۔ سارے افراد بشر فطرت کی بنیاد پر خلق ہوئے ہیں، اللہ تعالی نے اسے سارے انسانوں کو ودیعت فرمائی ہے۔

۳۔ وہ ہر طرح کی تغییر و تبدیلی سے مصون ہے۔

شگفت انگیز امر یہ ہے کہ فطری امور میں اختلاف نہ ہونے کے باوجود انسانوں کی اکثریت غفلت کے باعث فطری امور میں بھی اختلاف ہونے کا گمان کرتی ہے جس کے سبب زندگی کے مختلف شعبوں میں بہت سارے مصائب وآلام انسان کے دامنگیر رہتے ہیں در حالیکہ یہ بات واضح ہے کہ عقلی احکام کی اکثریت میں اختلاف کا امکان پایا جاتا ہے لیکن فطری احکام بدیہی ہیں جن میں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں۔مہم ترین فطری امور کی مثالیں یہ ہیں: حقیقت جوئی، خیر کی طرف میل رکھنا، حسن اور زیبائی کی جانب کشش رکھنا، خلاقیت اور عشق وپرستش وغیرہ۔

## ۴۔ عقل

کلمہ عقل لغت میں منع اور نہی کے معنا میں آیا ہے یعنی یہ انسان کو خواہشات نفسانی کی بے لاگ دنیا میں غرق ہونے سے بچانے والی قوت کا نام ہے، اچھائی اور برائی کے درمیان تمیز کرنے کے لئے یہ انسان کو تاریکی میں چراغ کا کام کرتی ہے، اسی عقل کی قوت کے بل بوتے پر ہی انسان کو دیگر حیوانات پر امتیاز حاصل ہے، یہ ادراک واستدلال کا وسیلہ ہونے کے ساتھ انسان کی مسوئلیت وتکلیف کا میزان وملاک بھی ہے۔اس کے علاوہ عقل باطنی حجت ہے اور حسن وقبح کی تشخیص کا ذریعہ بھی۔

## تعلیم وتربیت کی نسبت

تعلیم وتربیت کی نسبت میں کئی نکات اہم ہیں:

۱۔ انسانوں کی تربیت کے تین معانی بیان ہوئے ہیں اس لئے تربیت اور تعلیم کے درمیان تعلق اور نسبت کو بہتر انداز میں بیان کرنے کی خاطر تربیت کے متعدد معانی پر غور کرنا ضروری ہے۔تربیت تب تعلیم کا مقابل قرار پاتی ہے جب اس سے مراد انسان کے وجود میں علمی، احساساتی اور رفتار کے حوالے سے تبدیلی لانا ہو اور کبھی اس سے مراد انسان کی پوری شخصیت میں تبدیلی اور اس کا نتیجہ ہوتا ہے۔

۲۔ اگر تربیت کو تعلیم کے مقابلے میں سمجھا جائے تو ابتدائی (مقدماتی) تربیت کے علاوہ اس کی دیگر اقسام میں ضرور علمی مبنا ہونا چاہئیے۔ اس کے علاوہ ضروری ہے کہ متعلّم کی تربیت شروع کرنے سے پہلے اسے تعلیم دی جائے اس کے بعد تربیت کے لئے قدم اٹھایا جائے سوال یہ ہے کہ مقداماتی تربیت سے مراد کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ موضوع تربیت کے عنوان سے انسان کی پیدائش سے پہلے اور پیدائش کے بعد اس کی شناخت وآگاہی نمایاں ہونے کے مرحلے تک دی جانے والی تربیت کا نام مقدماتی اور عددی تربیت ہے جس کا ہدف یہ ہے جب متربّی

(شاگرد) پیدا ہوتا ہے تو اس کی تربیت کا عمل آسان اور بہت جلد مطلوبہ نتیجہ تک پہنچ سکے۔ جیسے فرزند صالح کی ولادت کے لئے مقدمات فراہم کرنا یہاں تک کہ روایات میں شریک حیات کے انتخاب کے سلسلے میں زیادہ خیال اور توجہ رکھنے کی تاکید ہوئی ہے۔

اس قسم کی تربیت میں متربّی (شاگرد) کو بصیرت نہیں دی جاتی ہے لیکن تربیت کی دوسری اقسام میں سے ہر قسم کی تربیتی سرگرمیاں کسی حد تک شعور و آگاہی پر مشتمل ہوتی ہیں۔

۳۔ اگر انسانی شخصیت کے ہر پہلو میں ہونے والی تبدیلی کو تربیت سمجھا جائے اور یہ یقین کر لیا جائے کہ انسان کے وجود میں اس کی شناخت، احساسات (جذبات) اور رویے میں آنے والی تبدیلی، تربیت کہلاتی ہے تو اس صورت میں تعلیم اور بصیرت مستقل طور پر تربیت کا مصداق شمار ہوتی ہیں جس میں متربّی (شاگرد) کو آگاہی اور شناخت دینے کے ساتھ اس کے وجود میں مطلوبہ تبدیلی کا رجحان پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور بالآخر اس کو اپنی شخصیت میں علمی اور عینی تبدیلی لانے پر مجبور کیا جاتا ہے حقیقت میں متربّی (شاگرد) کو بصیرت دینے کے ساتھ ہی تربیت کے تینوں مرحلے انجام پاتے ہیں۔

۴۔ اگر پوری شخصیت میں تبدیلی پیدا کرنے کو تربیت سمجھا جائے تو نہ صرف تعلیم بلکہ تربیتی عمل کے مراحل یعنی رجحانات، جذباتی تحریک ایجاد کرنا اور متربّی (شاگرد) کی رفتار کو منظّم کرنا بھی تربیت کا مقدمہ شمار ہونگے۔ البتہ تعلیم و آگاہی (جو کہ تربیت کے مقدمے کا حصہ ہے) کبھی بہت واضح ہوتی ہے اور کبھی مبہم اور غیر واضح ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں بعض اوقات ہمیں تربیت کے متعلق ہماری آگاہی کا علم ہوتا ہے اور کبھی ہم اس آگاہی سے لاعلم رہتے ہیں اور لاشعوری طور پر ہم عالمانہ و آگاہانہ رفتار اپناتے ہیں۔ (آثار شہید مرتضی مطہری)

## رہبر انقلاب کا دانشگاہ شریف کے طلباء سے اہم نصیحت

طلبا کی تحریک کو درپیش ایک اور خطرہ ان کے معیار کا گر جانا اور سطحی ہو جانا ہے۔ میرے عزیزو! سطحی انداز میں سوچنے سے سختی سے پرہیز کریں۔ عمیق فکر اور گہرائی کے ساتھ سوچنا یونیورسٹی کے طالب علم کی خصوصیت ہے۔ جو بات بھی سنیں، اس پر غور و فکر کریں۔ اسلام میں یہ کیوں کہا گیا ہے کہ " تفکر ساعة خیر من عبادة سبعین سنة" ایک لمحے اور ایک گھنٹے کی فکر برسوں کی عبادت سے بہتر ہے، اس لئے کہ اگر آپ نے فکر کی تو آپ کی عبادت بھی معنی و مفہوم کی حامل ہو جائے گی، آپ کی زندگی با معنی ہو جائے گی، آپ کی مجاہدت با معنی ہو جائے گی۔ آپ اپنے دوستوں کو پہچانتے ہیں اور دشمنوں کو بھی پہچانتے ہیں۔ فرض کریں کہ کسی محاذ پر کچھ لوگ ایسے آ جائیں جو اپنے محاذ اور دشمن کے محاذ کا فرق نہ سمجھ سکیں۔ حیران و پریشان اپنے ہی گرد گھومتے رہیں۔ کبھی ادھر فائرنگ کریں کبھی ادھر فائرنگ کریں، کبھی اوپر کی طرف فائرنگ کریں اور کبھی اپنے ہی اوپر فائرنگ کر لیں! دیکھئے اگر فکر نہ ہو تو انسان اس طرح ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ شور و غل مچا کے، ہلڑ ہنگامہ کر کے اور جھوٹے نیز بے بنیاد رنگا رنگ نعرے لگا کے طلبا کی انجمنوں اور ان کی تحریک کو اس سمت میں لانا

چاہتے ہیں۔ یہ طلبا کی تحریک کے لئے خطرناک ہے۔ سوچنا چاہیئے، غور و فکر کرنا چاہیئے اور غور و فکر کے ساتھ صحیح انتخاب کرنا چاہیئے۔ اگر اس نے غلط انتخاب بھی کر لیا تو چونکہ صاحب فکر ہے اس لئے اس سے آسانی سے بات کی جا سکتی ہے۔ جو شخص اہل فکر نہیں ہے، وہ جو بھی انتخاب کرلے، اس کے انتخاب میں اگر غلطی ہو تو اس سے منطقی بات نہیں کی جا سکتی۔ وہ اپنی نادانی، جہالت اور تعصب میں گرفتار ہے، لیکن اگر کوئی اہل فکر ہو اور اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو کوئی خیر خواہ اس سے بات کرکے اس کو بتا سکتا ہے کہ اس سے خطا ہوئی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے۔ سطحی سوچ نہیں ہونی چاہیئے۔ ہر سلوگن، ہر نعرے اور ہر بات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر سوچنا اور فکر کرنا چاہیئے۔ تمام معاملات میں فکر بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ معقول اور عقلمند انسانوں سے فکر کی توقع رکھی جاتی ہے۔

یونیورسٹی طلبا کی تحریک کو در پیش ایک اور خطرہ پارٹیوں اور گروہوں کے دام فریب میں آنے کا ہے۔ اس بارے میں میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے۔ ہوشیار رہنا چاہیئے، مختلف پارٹیوں اور گروہوں کے خطرناک آکٹوپس سے بچنا چاہیئے، ان کے دام فریب میں نہیں آنا چاہیئے۔ اس لئے کہ اگر ان کے دام فریب میں آ گئے تو وہ اس آزاد فکر رکھنے والے مجموعے اور تحریک کی مثبت خصوصیات سلب کر لیں گے اور اگر یہ ہو گیا تو پھر دشمنان انقلاب کے اختیار میں چلے جائیں گے۔ یہ اتنی خطرناک چیز ہوگی کہ زندگی، سرمایہ اور مستقبل سب کچھ ختم ہو جائے گا صرف حسرت رہ جائے گی۔ آخر میں میں صرف یہ سفارش کروں گا کہ آپ حضرات نہج البلاغہ کا مطالعہ کریں۔ نہج البلاغہ بہت زیادہ بیداری اور ہوشیاری پیدا کرنے والی کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے اور اس پر بہت زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔

## تعلیم و تربیت کے کچھ اہم بنیادی اصول

### ا۔ فطرت کے مطابق ہونا

اگر طالب علموں کی فطرت کے تقاضوں کو کچلنے کے بجائے ان کا احترام کرتے ہوئے انہیں تعلیم و تربیت دی جائے تو کامیابی ان کے لئے مقدر کا ستارا ثابت ہوگی۔ البتہ یاد رہے کہ تعلیم و تربیت کے نظام کو فطری امور سے ہماہنگ بنانا تب ممکن ہے جب معلم و مربی حضرات فطرت کے مفہوم اور فطری امور یا انسان کی پیدائشی امتیازات و خصوصیات سے آگاہ و آشنا ہوں۔ چنانچہ کثرت اہمیت کے پیش نظر ہم یہاں فطرت اور فطری امور کی جانب مختصر اشارہ کرنا پسند کریں گے۔ فطرت کا لفظ، علم فلسفہ، منطق قرآن، حدیث سمیت عرف عام میں استعمال ہونے والے الفاظ میں شمار ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کے معنی کا سمجھنا ناگزیر ہے۔ یہ عربی لفظ ہے، جو فعلہ کے وزن پر ہے اور عربی گرائمر کی رو سے فعلہ کا وزن نوعیت و کیفیت پر دلالت کرتا ہے، جیسے "جسلت جلسه زید" میں بیٹھا زید کے بیٹھنے کے انداز میں، پس فطرہ، خاص نوع کی خلقت و ایجاد بے سابقہ کے معنی میں ہے۔ انسان کی خلقت و پیدائشی خصوصیات اور امتیازات کے مجموعے کا نام فطری امور ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ بچوں کی فطری صلاحیتوں کو نادیدہ قرار دے کر انہیں تعلیم اور تربیت یافتہ بنانے کی جدوجہد کرنا ہرگز نتیجہ

خیز ثابت نہیں ہوگا۔ چنانچہ شروع میں بیان ہوا کہ تربیت کا مفہوم ہی انسان کی پوشیدہ استعداد اور صلاحیتوں کو پروان چڑھا کر شکوفا کرنے کا نام ہے۔

فطرت کے مفہوم کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لئے لفظ طبیعت اور غریزہ کے مفہوم سمیت معنی کے لحاظ سے فطرت اور ان کے درمیان پائے جانے والے فرق کا سمجھنا ضروری ہے جس کا خلاصہ یہ ہے: لفظ "طبیعت" جاندار و غیر جاندار دونوں پر اطلاق ہوتا ہے لیکن خاص طور پر غیر جانداروں کے لئے استعمال ہوتا ہے، یعنی بے جان چیزوں کی ذاتی خصوصیت کو طبیعت کہا جاتا ہے مثال کے طور پر مٹی تیل کی ذاتی خاصیت (سلگنے یا جلنے کی قابلیت) بیان کرتے وقت ہم کہتے ہیں کہ اس کی طبیعت ایسی ہے۔ اسی طرح عرف عام میں لوگ یہ کہتے رہتے ہیں کہ فلاں درخت کی طبیعت فقط گرم علاقوں میں باثمر ہونا ہے و...

توجہ رہے کہ جاندار اور بے جان چیزیں بعض خصوصیات میں مشترک ہوتی ہیں، اسی جہت مشترکہ کو مد نظر رکھتے ہوئے جاندار اشیاء جیسے حیوان اور پھول وغیرہ پر لفظ طبیعت کا اطلاق کرنا درست ہے۔

غریزہ یعنی جبلت یہ لفظ، نباتات اور جمادات پر تو سرے سے ہی اطلاق نہیں ہوتا، لیکن انسان اور حیوان کے لئے یہ استعمال ہوتا ہے، البتہ انسان کی نسبت یہ بیشتر حیوانات کے لئے استعمال ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غریزہ یا جبلت ہے کیا؟ اس کا مفہوم اور ماہیت کیا ہے؟ اس حوالے سے شہید مطہری دانشمندوں کی اس بات کو نقل کرتے ہیں: ابھی تک غریزہ "جبلت" کی ماہیت واضح نہیں ہے، یعنی ابھی تک کوئی شخص حیوانات میں غریزہ کے مفہوم کی صحیح وضاحت نہیں کر سکا ہے، اس کے بارے میں ہم فقط اتنا علم رکھتے ہیں کہ حیوانوں میں تکوینی طور پر نیم آگاہی و شعوری" کی ایک حالت پائی جاتی ہے جو ان کی زندگی میں راہنما کی حیثیت رکھتی ہے اس حالت کا نام غریزہ یعنی جبلت ہے۔

شہید مطہری (رح) نے اپنے آثار میں اس مطلب کی وضاحت کے لئے یہ مثال دی ہیں: حیوان کا بچہ انسان کے بچے سے مختلف ہوتا ہے۔ انسان کا بچہ جب دنیا میں آتا ہے تو پستان اس کے منہ میں ڈالنا پڑتا ہے اگرچہ بچہ بھی کسی حد تک اپنے ہونٹوں کو جنبش دیتا ہے، چلاتا ہلاتا ہے اور کمزور علامت کے طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ کسی چیز کا متلاشی ہے اور اس کی جستجو میں مصروف ہے۔ جبکہ حیوان کا بچہ پیدا ہوتے ہی کوشش کرتا ہے کہ اٹھ کھڑا ہو چند بار زمین پر گرتا ہے، لیکن آخر کار اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بغیر ماں کی رہنمائی کے اپنا سر ٹیڑھا کرتا ہے اور ماں کے شکم کے نیچے کچھ تلاش کرتا ہے، چنانچہ چند لحات میں وہ ماں کا پستان ڈھونڈ لیتا ہے اور دودھ پینا شروع کر دیتا ہے۔ اب گھوڑی کے بچے کو پیدا ہوتے ہی اٹھ کر ماں کے پستان کی جستجو کر کے اسے جلدی ڈھونڈ لینے کی ہدایت وہی حیوانی غریزہ "جبلت" کرتی ہے۔ فطرت کا لفظ انسانوں پر اطلاق ہوتا ہے اور یہ "طبیعت" و "غریزہ" کی طرح تکوینی مفہوم رکھتا ہے یعنی انسان کی سرشت کا ایک حصہ ہے۔

توجہ رہے کہ انسان کائنات کا پیچیدہ ترین موجود ہے، چنانچہ اس کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے والے بہت سارے محققین اور دانشوروں نے اپنے تحقیقی مواد کو مقالے اور کتابوں کی شکل میں منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہیں، یہاں تک کہ بعض نے اپنے مقالے کا عنوان یا کتاب کا نام ہی یہ رکھا ہے "انسان، مجہول موجود" "انسان، پر اسرار موجود" "انسان ناشناختہ موجود" وغیرہ-انہوں نے اپنے آثار میں مختلف پہلوؤں سے انسان کے وجود کی تفسیر و تشریح کرنے کی جدوجہد کی ہے، اسی طرح انہوں نے اس کے سب سے پیچیدہ موجود ہونے کے اسباب و علل کو واضح کرنے کے لئے فکر انگیز باتیں لکھی ہیں، لیکن اس کے باوجود آج تک انسان کے پر اسرار وجود پر جامع تبصرہ لکھنے میں کسی محقق کو کامیابی نہیں مل سکی، البتہ ہر زمانے میں اس پیچیدہ موجود پر غور کرنے والوں کی حیرت میں اضافہ ضرور ہوتا رہا ہے اور ان کے لئے انسان زیادہ مجہول ہوتا رہا ہے۔انسان کائنات کا سب سے پیچیدہ اور مجہول موجود ہونے کی وجوہات کا اگر اسلامی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ نکتہ سمجھ میں آتا ہے کہ انسان نہ جمادات اور نباتات کی طرح خالص مادی ہے اور نہ ہی وہ حیوانات کی طرح عقل سے عاری فقط خواہشات رکھتا ہے، بلکہ وہ کائنات کا تنہا ایسا موجود ہے جو جسم اور روح کا مرکب ہے اور خواہشات کے ساتھ عقل کی نعمت سے بھی مالا مال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق کا شغف رکھنے والے دانشمند جب انسانی وجود کو سمجھنے کے لئے مطالعہ و تحقیق کرتے ہیں تو مجہولات کا ایک طولانی سلسلہ ان کے سامنے پہاڑ بن کر نمایاں ہو جاتا ہے، مسئلہ فطرت اس سلسلے کی ایک کڑی شمار ہوتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان فطریات کا حامل ہے؟ کیا واقعتاً ایسے امور ہیں جنہیں فطری یا غیر کسبی کہلاتے ہیں؟ اس حوالے سے مختلف نظریات پڑھنے کو ملتے ہیں، سر دست ہم یہاں تین نظریے کی طرف اشارہ کریں گے :

۱) بعض کہتے ہیں کہ انسان کی ساری معلومات کسبی ہیں، وہ فطری یا غیر کسبی معلومات کا حامل ہی نہیں، یعنی ان کا کہنا یہ ہے کہ دنیا میں آنے کے بعد ہی انسان آہستہ آہستہ اشیاء کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہے، جب وہ دنیا میں آتا ہے تو مطلّقاً جاہل ہوتا ہے-ان کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے "اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے بطنوں سے اس عالم میں پیدا کیا ہے کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور تمہیں قوت سماعت بصارت اور دل عطا کیا تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ۔[1]

۲) پہلے نظریئے کے بالکل برعکس افلاطون اس بات کا قائل ہے کہ انسان کی تمام معلومات غیر کسبی و فطری ہیں، وہ اس بات پر باور رکھتا ہے کہ انسان کی روح اس کے بدن میں داخل ہونے سے پہلے عالم مثال میں ہوتی ہے، وہاں وہ دنیا کے تمام موجودات کے حقائق سے آشنا ہوتی ہے، وہ ساری چیزوں کو جانتی ہے، لیکن جب وہ بدن سے متصل ہوتی ہے تو بدن، حقائق عالم کی معلومات اور انسانی روح کے درمیان مانع و حجاب بنتا ہے، جس کے سبب دنیا میں آتے ہی انسان انہیں وقتی طور پر فراموش کر دیتا ہے، البتہ تعلیم و تعلم کی بدولت اسے ساری چیزیں دوبارہ یاد آنے لگتا ہے۔ یعنی افلاطون کی نظر میں تعلیم کا مقصد تذکر و یاد آوری ہے، اس سے کسی قسم کا کوئی مجہول معلوم

---

[1] نحل ۷۸

میں نہیں بدلتا، اس لئے کہ اس کی نظر میں انسان کے لئے کوئی بھی چیز مجہول نہیں ہوتی بلکہ ساری چیزیں اس کے لئے ماں کے بطن سے باہر آنے سے پہلے عالم مثال میں معلوم ہو چکی ہوتی ہیں۔

۳) اسلامی حکماء کے مطابق انسانی فکر کے وہ اصول اولیہ جو تمام انسانوں میں مشترک طور پر پائے جاتے ہیں فطری ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ انہیں سمجھنے کے لئے انسان کو منطقی برہان قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، اسی طرح انہیں درک کرنے کے لئے انسان کسی معلم یا تجربے کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ جیسے ہی وہ ان امور کو دیکھ لیتا ہے، ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ انہیں سمجھ لیتا ہے، جیسے "کل جز سے بڑا ہے" اسے سمجھنے کے لئے فقط کل اور جزء کا تصور کرنا کافی ہوتا ہے۔ جب بھی انسان کے لئے ان دونوں کا تصور پیدا ہوتا ہے اور وہ ان کا موازنہ کرتا ہے تو کسی برہان اور تجربے کی طرف محتاج ہوئے بغیر وہ یہ حکم کر دیتا ہے کہ کل جز سے بڑا ہے۔[1]

شہید مطہری (رح) نے فطرت کی بحث میں ان دو واقعے کو نقل کیا ہے: پہلا واقعہ یہ ہے کہ ابو ریحان بیرونی مرض الموت میں مبتلا تھے، ان کا ایک ہمسایہ فقیہ تھا، وہ ابو ریحان کی عیادت کے لئے آیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ بستر پر پڑے ہیں اور رو بہ قبلہ لیٹے ہوئے ہیں اور زندگی کی آخری سانس لے رہے ہیں۔ ابو ریحان نے اپنے اس ہمسائے سے وراثت کا ایک شرعی مسئلہ پوچھا۔ اس فقیہ کو تعجب ہوا اور کہنے لگا کہ یہ کون سا وقت ہے مسئلہ پوچھنے کا؟ ابو ریحان کہنے لگے مجھے معلوم ہے کہ میں مر رہا ہوں لیکن آپ سے یہ مسئلہ پوچھ رہا ہوں اگر میں اس مسئلہ کا جواب جان کر مر جاؤں تو بہتر ہے یا نہ جانتے ہوئے مر جانا؟ واضح ہے کہ جان کر مرنا بہتر ہے ابو ریحان کہنے لگا پھر اس کا جواب بتائیں؟ اس نے جواب دیا۔ اس فقیہ کا کہنا ہے کہ میں ابھی واپس اپنے گھر نہ پہنچا تھا کہ ابو ریحان کے گھر سے عورتوں کے رونے کی آواز آنے لگی۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ لکھتے ہیں حجۃالاسلام سید محمد باقر شفتی اصفہانی مرحوم کے بارے میں بھی ایک واقعہ ہمارے قدماء نے نقل کیا ہے اور بالکل ایسا ہی واقعہ پاسچر کے بارے میں بھی ہے۔ جناب سید باقر مرحوم کی شب زفاف تھی جب دلہن کا ہاتھ دلہا کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے اور پھر عام طور پر عورتیں دلہن کو حجلہ عروسی (وہ خاص کمرہ جو دلہن کے لئے آراستہ کیا جاتا ہے) میں لے جاتی ہیں اس وقت جناب سید محمد باقر کسی دوسرے کمرے میں چلے گئے تاکہ جب عورتیں چلی جائیں تو پھر دلہن کے پاس جائیں تو انہوں نے سوچا کہ موقعے سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے اور مطالعہ کیا جائے انہوں نے مطالعہ شروع کر دیا۔ عورتیں چلی گئیں دلہن بیچاری تنہا بیٹھی رہی بہت انتظار کیا کہ دولہا میاں آ جائیں مگر وہ نہ آئے۔ سید محمد باقر جب متوجہ ہوئے تو وقت سحر تھا یعنی علم کی کشش نے انہیں اس طرح سے جذب کر لیا کہ وہ سہاگ رات اپنی دلہن کو بھول گئے۔

طالب علموں کی تعلیمی اور تربیتی نظام میں اس فطری اہم پہلو کا رنگ نمایاں ہونا ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر تعلیم و تربیت کا مقصد پورا کرنے کی توقع لغو ہے۔ کمال مطلق کا قرب حاصل کرنے کی منزل کی طرف پرواز کرنے میں تعلیم اور تربیت انسان کے لئے دو پر کی

---

[1] آثار شہید مطہری

حیثیت رکھتے ہیں۔ جو نظام تعلیم وتربیت طالب علموں کو خدا شناس نہیں بناتا یقین کیجئے وہ ان کے لئے مضر ہی ثابت ہوگا نہ مفید۔ علم انسان کے لئے روشنی اور نور تب ثابت ہوگا جب خدا شناسی کی فکر اس کی روح قرار پائے۔

آج ہمارے اکثر تعلیمی درسگاہوں میں رائج نظام تعلیم وتربیت کا غائرانہ مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت کو سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ اس تعلیمی سسٹم میں بہت سارے نقائص پائے جاتے ہیں، جن میں سے بہت بڑی خامی یہ ہے کہ طالب علموں کو بالکل غیر محسوس انداز میں خدا اور احکام خداوندی سے دور کرنے والے افکار کی تعلیم اس کا حصہ ہے، وہ نظام تعلیم شرم وحیا اور حجاب کو روشن خیالی کا منافی قرار دے کر بے پردگی اور فحاشیت سے جینے کی تلقین کرتا ہے، اسلامی تعلیمات کو دقیانوسی قرار دے کر نونہالوں کو مادی لزتوں میں غرق رہنے کی تاکید کرتا ہے، مذہبی اور دینی انسانیت ساز معارف کو قصہ پارینہ قرار دے کر سائنسی معلومات حاصل کرنے کو ہی سعادت انسان کا حقیقی سبب ہونے پر دانش آموزوں کو باور کراتا ہے۔ جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ ہمارے اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں مغربی نظام تعلیم وتربیت کا راج ہے, جس میں خدا کی بجائے مادے کو محوریت حاصل ہے، یہ تعلیمی نظام طالب علموں کے ذہنوں میں جسمانی منافع اور ضروریات سے مربوط خیالات کو تقویت فراہم کرنے کی توسکت رکھتا ہے لیکن معنوی اور روحانی ضروریات مضبوط کرنے کی توانائی نہیں رکھتا، بلکہ معنویات سے دور کرنے والی طرز فکر وہ ان کے ذہنوں میں راسخ کردیتا ہے۔ ہماری درسگاہوں میں ترجیحی بنیاد پر طالب علموں کو عقائد، احکام اور اخلاقی باتوں پر مشتمل کوئی کتاب نہیں پڑھائی جاتی, جس کے باعث ان میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے ذہنوں میں اسلامی معلومات کی کمی رہ جانا بدیہی اور واضح ہے۔ جب کہ ایک مسلم طالب علم کے لئے مسلمان ہونے کے ناتے دین کے بنیادی مسائل سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ مغرب کی اندھی تقلید اور پیروی کرتے ہوئے ہماری تعلیمی درسگاہوں میں بچوں کو تعلیم وتربیت دینے کا چلن عام ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں پڑھنے والوں کی اکثریت, اسلامی اور انسانی اقدار واصولوں سے ناآشنا ہوتی ہے، بلکہ بہت سارے تو مذہب اور دین سے بیزار ہوتے ہیں، وہ واجبات ومحرمات الہی اور حلال حرام پر مبنی احکام سے روگردانی کرنے میں ہی اپنی عافیت تلاش کرتے ہیں، یوں اندھی تقلید میں تعلیم کے نام سے وہ کچھ خشک اصطلاحات اور فارمولے یاد کرلیتے ہیں، وہ اسی کو اپنی زندگی کا اصلی سرمایہ قرار دیتے ہیں اور حقائق سے دور ہوکر دنیا کے کسی کونے میں اپنی دوروزہ زندگی جہالت تلے اندھیرے میں گزار دیتے ہیں۔ وہ اقدار اسلامی سے نابلد ہونے کی وجہ سے نہ اپنی حقیقت پہچان پاتے ہیں اور نہ اپنے خالق کی معرفت۔ جب کہ انسان بڑی قیمتی مخلوق ہے, اس کی زندگی کا ہدف بہت بلند ہے، مگر اسلامی تعلیمات سے غافل ہونے کی وجہ سے آج کے انسانوں کی اکثریت کو نہ انسان کی قدر ومنزلت کا ادراک ہے اور نہ ہی انسانی زندگی کے ہدف کی شناخت۔ وہ انسانوں کے بارے میں فقط اتنی معرفت رکھتی ہے کہ ان کے دو ہاتھ ہیں اور دو پاوں، وہ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، سوتے ہیں، چلتے ہیں اور بات کرتے ہیں، ان کی دو آنکھ اور دو کان ہیں، وغیرہ اسی طرح انسان کی زندگی کے ہدف کے حوالے سے وہ اتنا جانتی ہے کہ جس کی زندگی آسائش اور رفاہ میں گزرے اس نے اپنی زندگی کے ہدف کو پالیا ہے، اس کے برخلاف جس کی زندگی عسرت وتنگدستی میں بسر ہورہی ہو وہ ہدف زندگی سے کوسوں دور ہے۔ انسان اور اس کی زندگی کے مقصد کے بارے میں رکھنے والی ایسی شناخت درحقیقت شناخت نہیں بلکہ جہالت ہے۔ اسی بے بنیاد شناخت کی بناء پر آج پوری دنیا میں مخصوصا فلسطین

، کشمیر، یمن افغانستان اور پاکستان جیسے ممالک میں سب سے ارزان چیز انسان اور اس کی زندگی ہے۔مفاد پرست اور شہوت نفسانی کے اسیر لوگ جس کسی سے بھی اپنے مفادات کے لئے خطرے کا احساس کرتے ہیں اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے میں دیر نہیں کرتے۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انسان اور اس کی زندگی کے مقابلے میں کوئی نعم البدل ہے ہی نہیں۔انسان کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا، وہ ایسی مخلوق ہے کہ جس کی پیدائش پر خدا نے اپنی تمجید کی، تمام کائنات کے اشیاء کو اس کے لئے مسخر بنا دیا، اسے اپنی پرستش عبادت و معرفت کے لئے پیدا کیا گیا وغیرہ....

مگر افسوس! ہمارے معاشرے کے مسلمان ان سوالوں پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے جس کی بنیادی وجہ اسلامی اصولوں کے مطابق تعلیم وتربیت کی دولت سے ان کا محروم ہونا ہے۔ نیز دلیل و منطق کی پیروی کرنے کے بجائے اندھی تقلید کے زندان میں ان کا قید ہو کر رہنا ہے۔روشن خیال پڑھے لکھے طبقے کو تو کم از کم یہ سمجھنا چاہیے کہ اندھی تقلید کے بجائے انسان کو دلیل اور منطق کی بنیاد پر تحقیق کرکے دوسروں کے عقائد اور نظریات کی نفی یا تایید کرنا ہی معقول اور اصولی روش ہے۔بغیر کسی تحقیق کے کسی کے بارے میں رای قائم کرنا توہمات و تخیلات کی دنیا میں زندگی گزارنے والوں کا کام تو ہو سکتا ہے عقلاء کا نہیں۔ بہر صورت ہمارے تمام مسائل (سیاسی سماجی مذہبی) کا حل روایتی تعلیم وتربیت کی روش سے ہٹکر فطری اصولوں کو سمجھ کران کے مطابق معاشرہ انسانی کو تعلیم وتربیت کے نور سے منور کرنے میں ہی مضمر ہے۔خود شناسی اور خدا شناسی کے موضوع کو تعلیم اور تربیت کی بنیاد قرار دیئے بغیر تعلیمی درسگاہوں میں پڑھنے والوں کو سعادت اور حقیقی کامیابی کا حصول ممکن نہیں۔ ہماری تعلیمی درسگاہوں میں پڑھنے والے جب کورس کی کتابوں کو پاس کرتے ہوئے ڈگری لیتے ہیں تو سمجھتے ہیں بس ہم تو تعلیم یافتہ ہو چکے، ہم اپنی ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری کے بل بوتے پر بڑے عہدوں پر فائز ہو کر جاب کر سکتے ہیں، ہماری تو تقدیر ہی بدل جائے گی، ہم تو اب عیاشی کی زندگی بسر کر پائیں گے و... لیکن علامہ اقبال جیسے مفکروں کی نظر میں تعلیمی میدان کی کامیابی کا معیار کچھ اور تھا۔ لیجئے ان کے فقط ان دو اشعار پر ذرا غور کیجئے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کی گنبد پر

تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

اس بات کی طرف پہلے اشارہ ہوا کہ خدا شناسی حقیقت جوئی کا بارز مصداق اور حقیقت جوئی فطری امور میں سر فہرست شامل ہے۔آج اگر ہمارے تعلیمی اداروں میں طالب علموں کی دینی اور مذہبی پیاس بجھانے کی جد و جہد کو نظر انداز کرکے فقط انہیں سائنس اور ریاضی

وغیرہ کے فارمولے ازبر کرانے کی تعلیم دی جاتی ہے تو بلاشبہ اس کاوش کا رائیگان ہونا یقینی ہے، کیونکہ یہ تعلیم وتربیت کے اہم اصول کا منافی ہے۔ دین، انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔۔[1]

اسلام جیسے ادیان کی تعلیمات میں کھلے الفاظ میں ظالم اور طاغوت کے مقابلے میں خاموشی اختیار کرنے کی بھرپور مزمت ہوئی ہے۔ ان میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مظلوم کی حمایت اور ظالم کی مخالفت میں قیام کیا جائے، ان کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملانے کی بھرپور جدوجہد کی جائے۔ جس کی عملی تصویر معصومین ع کی پاکیزہ زندگی ہے۔ ظلم وبربریت کے خلاف جہاد اور قیام تمام انبیاء سمیت ائمہ ہدی (ع) کی مقدس زندگی کا نمایاں پہلو شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے زندگی بھر معاشرہ انسانی سے ظلم وستم کا خاتمہ کرکے اسے عدل وانصاف سے مزین کرنے کی کوشش کی۔ ثقل اکبر اور ثقل اصغر کے ارشادات عالیہ کا اہم حصہ محکوم ومقہور قوموں کو استکبار کی چنگل سے نجات دلا کر انہیں خوشحال زندگی فراہم کرنے کی تاکید، اس کے طریقہ کار اور اس کے لئے ضروری مقدمات، شرائط ولوازمات کی تعلیم پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ معصوم ہستیوں کی سیرت طیبہ میں بھی ہمیں ظالم وستمگر کے خلاف مقاومت اور مجاہدت کرتے ہوئے ان سے کسی قیمت پر سمجھوتہ نہ کرنا دکھائی دیتے ہیں، جس کی آشکار مثال سید الشہداء امام حسین (ع) کی سیرت ہے۔ آج دنیا میں انسانوں کی اکثریت ضلالت کے راستے پر گامزن ہے۔ وہ نہ جینے کے سلیقے سے واقف ہے اور نہ مرنے کے طریقے سے آشنا۔ اکثر انسانوں کی نظر میں حیوانوں کی طرح کھانا، پینا اور خواہشات نفسانی کی تکمیل کرکے تولید نسل کرنا زندگی ہے۔ ان کی نگاہ میں دوسروں پر ظلم کرنا، دوسروں کی جان، مال، عزت اور آبرو سے کھیل کر اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کرنا لذت بخش زندگی ہے۔ نواسہ رسول حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے عمل کے ذریعے تاابد بشریت کو جینے اور مرنے کا سلیقہ سکھادیا۔ دنیا میں جی کر مرنے سے تو ہر کوئی آشنا ہے، ہر انسان کو اس بات کا علم ہے کہ دنیا میں آنکھ کھولنے کے بعد ایک مدت تک انسان نے زندہ رہنا ہے، جینا ہے، زندگی کی نعمت سے لطف اندوز ہونا ہے پھر انجام موت ہے اور مرنا ایک اٹل حقیقت ہے۔ موت سے نہ کوئی بچا ہے اور نہ بچے گا، اس سے فرار کسی کے لئے ممکن نہیں۔ مظلوم کربلا ابی عبداللہ الحسین علیہ السلام نے دنیائے انسانیت کو نہ فقط حقیقی معنوں میں حیات اور موت کا مفہوم سمجھایا، بلکہ نواسہ رسول نے آدم کی آولاد کو مر کر جینا بھی سکھادیا ہے۔ آپ نے مرنے سے پہلے کی زندگی کا تصور یوں پیش کیا ہے کہ اگر لوگ حق سے متصل رہ کر عزت سے زندگی بسر کر رہے ہوں تو واقعی معنوں میں وہ زندہ ہیں، لیکن اگر وہ حق سے منہ موڑ کر باطل کی آغوش میں ذلت سے زندگی کے لمحات گزار رہے ہوں تو ایسی زندگی زندگی نہیں موت ہے۔ اسی طرح حسین ابن علی (ع) کی منطق میں اگر کوئی راہ حق میں عزت سے مر جائے تو حقیقت میں وہ مرا نہیں ہے بلکہ ایسی حیات کا مالک بنا ہے، جس کے بعد کوئی موت نہیں۔ حسین ابن علی (ع) کی نظر میں ظلم کے زیر سایہ ظالموں کی حکمرانی قبول کرکے زندہ رہنا موت کا مترادف تھا، جس کی وجہ سے آپ نے یزید جیسے ظالم وسفاک انسان کی بیعت قبول کرنے سے انکار کیا اور راہ حق میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرکے حیات خالدہ کا مالک بن گئے اور دنیا والوں کو درس حریت، عزت، غیرت، ایثار وفداکاری

---

[1]) استفادہ از آثار شہید مطہری

دے گئے۔ اسی طرح آپ (ع) نے دنیاوالوں کو حق و باطل کی پہچان کروا کر اہل حق کی حمایت اور اہل باطل سے نفرت کرنے کا سبق بھی سکھا کر گئے۔ امام حسین (ع) دین پر اپنی جان نچھاور کرکے بظاہر دنیاوالوں کی نظروں سے تو غائب ہو گئے مگر حقیقت میں آپ حیات خالدہ کا مالک بن کر آج بھی سینکڑوں انسانوں کے دلوں پر راج کر رہے ہیں۔

## ۲۔ عدالت خواہی

انسان کے فطری امور میں سے ایک عدالت خواہی ہے پس تعلیم اور تربیت کا نظام، عدل اور انصاف کی بنیاد پر قائم واستوار ہونا ضروری ہے۔ جب سٹوڈنس ایک عرصہ کسی تعلیمی ادارے سے منسلک رہتے ہیں، اس میں پڑھتے ہیں اور وہاں کے اساتذہ سے کسب فیض کرتے ہیں تو ان میں تعلیمی قابلیت کے ساتھ دھیرے دھیرے عدالت کی صفت بھی پروان چڑھنا ضروری ہے، یہ تب ممکن ہوگا جب اس میں نافذ نظام تعلیم وتربیت کا بنیادی عنصر عدل وانصاف ہو۔ توجہ رہے کہ طالب علموں کے لئے نصابی کتابیں مرتب کرتے وقت عدل وانصاف پر مبنی تاریخی واقعات اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے والے مواد کو کتابوں کی زینت بنانا لازم ہے۔ کلاسوں میں طالب علموں کو لیکچر دینے کے دوران روزانہ عدل وانصاف کی ضرورت اور اہمیت کے موضوع پر اساتذہ کے لئے مختصر گفتگو کرنا ضروری ہے۔ تعلیمی اداروں میں کسی کے ساتھ ناانصافی ہو جائے تو اسے انصاف دلانے کے لئے ملکر آواز اٹھانے کی عادت کرنا ناگزیر ہے۔ غرض تعلیمی درسگاہوں کے ذمہ داروں کو سر جوڑ کر طالب علموں کے لئے تعلیمی اداروں میں عدل وانصاف سے لبریز ماحول بنانا بہت ضروری ہے، کیونکہ کل کا معاشرہ آج کے انہیں جوانوں اور نوجواں سے تشکیل پانا ہے۔ جب تحصیل کے دوران طالب علموں کے ذہنوں میں عدل وانصاف کی اہمیت راسخ ہو جائے تو کل کلاں وہ ذمہ دار فرد کی حیثیت سے معاشرے میں نمودار ہوں گے، معاشرے کا حصہ بن کر جب وہ کسی شعبے میں فعالیت سرانجام دیں گے تو وہ ہر قدم پر عدل وانصاف کی رعایت کرنے کی کوشش کریں گے اور کسی کی حق تلفی کرنے سے حتی المقدور اجتناب کریں گے، جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ عادلانہ معاشرے کا قیام ہوگا، لوگوں کو امن اور چین کی زندگی میسر ہوگی و۔۔۔ چینی بڑے فلسفی کنفیوشس سے کسی نے پوچھا کہ اگر ایک قوم کے پاس تین چیزیں (انصاف، معیشت دفاع) ہوں اور مجبوری کی بناء پر اسے ان تینوں میں کسی ایک کو چھوڑنا پڑے تو بتایئے وہ ان میں سے کس چیز کو چھوڑی جائے؟ اس نے جواب میں کہا دفاع کو ترک کردو۔ سوال کرنے والے نے پھر پوچھا اگر باقی ماندہ چیزوں (انصاف معیشت) میں سے ایک کو چھوڑنا لازمی ہو تو کیا کیا جائے؟ کنفیوشس نے جواب دیا معیشت کو چھوڑدو۔ اس پر سوال کرنے والے نے حیرت سے کہا معیشت اور دفاع کو ترک کیا تو قوم بھوکوں مر جائے گی اور دشمن حملہ کر دینگے؟ کنفیوشس نے جواب دیا نہیں! ایسا نہیں ہوگا، بلکہ ایسا ہوگا کہ انصاف کی وجہ سے اس قوم کو اپنی حکومت پر اعتماد ہوگا اور لوگ معیشت اور دفاع کا حل اِس طرح کریں گے کہ پیٹ پر پتھر باندھ کر دشمن کا راستہ روک لیں گے۔

اس صفت (عدالت) کی زیادہ اہمیت کے پیش نظر اسلامی وغیر اسلامی مفکرین ومحققین نے اس پر توجہ دی ہے، انہوں نے اپنی معلومات کے مطابق اس پر تبصرہ وتجزیہ کرنے کی جدوجہد کی ہے۔ ارسطو نے فضیلت کی بحث پر توجہ کرتے ہوئے ہر چیز میں میاں روی اختیار کرنے

کو عدالت کی بنیاد قرار دیا ہے۔ سیسرون سمیت روم کی حکومت کا خاتمہ ہونے کے بعد اس کے مختلف شہروں میں جا بسنے والے حقوق دان اس بات کے معتقد تھے کہ طبیعی حقوق یا طبیعت کے مطابق عمل کرنا عدالت ہے۔ رسانس کے زمانے میں عدالت، آزادی, مساوات سمیت بہت سارے مفاہیم میں حیرت انگیز تبدیلی ایجاد ہوئی۔ اس تبدیلی کے ایجاد کرنے والوں میں نیکولو ماکیاولی کا نام بھی شامل تھا، اس کی نظر میں نظم، امنیت اور قدرت کو دیگر تمام انسانی اقدار پر ترجیح حاصل تھی، اس نے عدالت پر قدرت کو برتری حاصل ہونے کے بارے میں لکھا ہے: جمہوری حکومتوں میں عوام کو آزادی و استقلال جیسے نعروں کے ذریعے ہر گز خاموش نہیں کیا جاسکتا، ان کو احتجاج اور شورش سے خاموش رکھنے کا اطمینان بخش راستہ یہ ہے کہ ان کے شہروں اور بستیوں کو ویران کر دیا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ حکمران انہیں کے درمیان جا کر رہیں۔ اسی کے دور میں بعض اس بات کے قائل تھے کہ عدالت سے مراد مساوات اور برابری ہے۔ البتہ بعض دانشمند جیسے ژان بدن اور بوسہ باور رکھتے تھے کہ دین کے بغیر کوئی بھی حکومت اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتی اور معاشرے میں اجتماعی عدالت دین کی اساس پر استوار ہوا کرتی ہے۔ ہابز کے عقیدے کے مطابق عدالت عہد و پیمان سے عبارت ہے بشرطیکہ دوسروں نے بھی اپنے قول و قرار کی وفا کی ہوں۔ لاک نے بھی طبیعی حقوق کو مبنا قرار دیتے ہوئے جان, مال اور آزادی کی حفاظت کو باب عدالت کا مہمترین مسئلہ قرار دیا ہے۔ ڈیوڈ ہیوم کی نظر میں تمام لوگوں کے فائدے کا سرچشمہ عدل و انصاف ہے۔ روسو اور کانٹ کے مطابق انسانی اخلاقیات میں سرفہرست عدالت کی صفت ہے نیز کانٹ کی نظر میں اخلاق، سیاست کی بنیاد ہے۔[1]

اسلامی مآخذ میں یہ صفت غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ قرآن کریم نے کھلے الفاظ میں بشریت کی ہدایت کے لئے مبعوث ہونے والے انبیاء کا ایک ہدف معاشرہ انسانی میں قسط و عدل کے قیام کو قرار دیا ہے۔ بلاتردید یہ انسانیت ساز اور انسان کے لئے سرنوشت ساز صفت ہے۔ اس کے حامل افراد نہ فقط اپنی انفرادی زندگی میں کامیابی سے ہمکنار ہوں گے، بلکہ معاشرے کے اندر بھی ان کا مقام بلند رہے گا۔ جب وہ عادلانہ زندگی بسر کریں گے تو محبوب خدا بھی قرار پائیں گے، درنتیجہ ایسے افراد دنیا و آخرت دونوں میں سرخرو ہوں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عدل کسے کہا جاتا ہے؟ اس کا مفہوم کیا ہے؟۔ جواب یہ ہے کہ لغت کے ماہرین نے اپنی کتابوں میں عدل کے متعدد معنی بیان کئے ہیں، جیسے امور میں میاں روی اختیار کرنا، تعادل و تساوی، استوا و استقامت اور افراط و تفریط کی حد وسط۔ ان میں سے عدل کے جامع معنی ہر چیز کو اپنے مناسب مقام پر رکھنا ہے۔ یاد رہے کہ ہر چیز کا مقام بحسبہ ہے۔ اس بناء پر عالم طبیعت کا مقام اسی حساب سے ہے اور انسانی معاشرے کا مقام اسی حساب سے ۔

عدل کی اہمیت کے لئے یہی کافی ہے کہ خدا کی ذات کا نمایاں وصف عدل ہے جسے اعتقادی کتب میں اصول دین کا دوسرا قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالی کی نسبت عدل کو ایک اعتبار سے تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جو عدل تکوینی، تشریعی اور جزائی سے عبارت ہے۔ عدل تکوینی سے مراد یہ ہے کہ خدا ہر موجود کو وہ وجود عطا کرتا ہے جس کا وہ مستحق و سزاوار ہے۔ وہ افاضہ اور ایجاد و آفرینش کے میدان میں کسی کو

---

[1]) استفادہ از مقالات فارسی

مہمل نہیں چھوڑتا- عدل تشریعی سے مراد یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالی انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا ویسے ہی انسان کی مادی و معنوی سعادت کا باعث بننے والی تکلیف کو وہ ضرور بیان کر دیتا ہے- عدل جزائی سے مراد جزاء اور پاداش کے مقام میں خدا صالح و فاسد اور مومن و کافر کے ساتھ یکسان سلوک نہیں کرتا، بلکہ ہر انسان کو اس کے اعمال کے مطابق جزاء دیتا ہے[1]-آج ہماری زندگی کے تمام شعبوں میں عدل اور انصاف نہ ہونے برابر ہے- مخصوصا سیاست کے شعبے میں تو اس کا وجود تقریبا مٹ چکا ہے- عدل کے مقابلے میں ظلم ہے-ایک دو ملکوں کو چھوڑ کر کم و بیش دنیا کے تمام ممالک میں عدل و انصاف سے عاری ظالموں کی حکمرانی ہے، جس کی وجہ سے غریب عوام ظالم و ستمگر حکمرانوں کے مظالم کی چکی میں پستے جا رہے ہیں سیاست کے نام پر جاہل اور بے دین افراد بر سر اقتدار ہیں جو اشرف المخلوقات کہلانے والی مخلوق کے لئے عذاب الیم ثابت ہو رہے ہیں-

اسلامی تعلیمات میں سیاست کی جان ہی عدل و انصاف ہے-اس سے ہٹکر کی جانے والی سیاست سیاست نہیں بلکہ اسے شیطنت کہلاتی ہے۔ ہمارا دور مادی، علمی اور فکری ترقی کا دور ہے۔ ایک دور تھا کہ لوگ غاروں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ہر جہت سے لوگ پسماندگی کا شکار تھے۔ تفکر اور تعقل کی روشنی میں زندگی کے امور چلانے سے لوگ قاصر تھے۔ نہ وہ اجتماعی و معاشرتی زندگی کی اہمیت سے آشنا تھے اور نہ ہی وہ امور زندگی میں ترجیحات کی تشخیص کی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ انسان و انسانیت کی منزلت، وقار اور صفات سے بھی ناواقف تھے، لیکن ہمارے دور میں پوری دنیا سمٹ کر انسان کی مٹھی میں بند ہو چکی ہے۔ بچہ بچہ منٹوں میں پوری دنیا کے حالات سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔ غرض ہمارا دور گزشتہ ادوار سے مادی، علمی، فکری و،،، ترقی کے اعتبار سے ہرگز قابل موازنہ نہیں، لیکن اس کے باوجود ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آج کے ہمارے ترقی یافتہ معاشرے میں ہمارے علم سے کہیں زیادہ ہماری جہالت کا راج ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ حق بجانب ہوگا کہ ہماری جہالت میں روز بروز مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

اتنی علمی پیشرفت کے باوجود کچھ مفاہیم سے ہم نہ صرف جاہل ہیں بلکہ ان کی نسبت ہم جہل مرکب کا شکار ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم ان مفاہیم سے جاہل و بیگانہ ہیں۔ ان مفاہیم میں سرفہرست سیاست کا مفہوم ہے۔ ہمارے معاشرے میں بحث و مباحثے اور نقد و اشکال کے لئے لوگوں کا سب سے محبوب و دلچسپ موضوع سیاست ہے۔ اپنی سیاسی پارٹی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اور اپنے حریف کو زیر کرنے کی خاطر لوگ کٹ مرتے ہیں، لیکن سیاست کی حقیقت سے لوگ بالکل اجنبی ہیں۔ آج ہمارے معاشرے میں جو جتنا مکار، فریب کار، دروغگو اور چالاک ہوگا، اس کو اتنا ہی بڑا سیاست دان سمجھا جاتا ہے۔ آج کی دنیا میں آزادی بشر، حقوق بشر اور حفاظت حقوق بشر کی آڑھ میں صرف اپنے مفادات حاصل کرنے والے، ظالم استکباری طاقتوں کی قربت حاصل کرنے والے سب سے زیادہ سیاست دان ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کی سیاست بلاشبہ ظلم و ستم پر مبنی ہے۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ظلم کو دوام حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ نابودی اور سرنگونی ہے۔ جس کے بہت سارے نمونے تاریخ بشریت کے سینے میں محفوظ ہیں، جسے معرکہ کربلا، حزب اللہ و اسرائیل کی

---

[1] کتاب شیعہ عقائد کا تجزیہ و تحلیل، ص ۲۳۰

جنگ، صدام کے دور کی جنگ، ظالم رضا شاہ کے خلاف ایرانی قوم کی جنگ میں ہم دیکھ سکتے ہیں -دنیا کے سیاستمدار اور حکمرانوں کو علی ابی طالب ع سے سیاست سیکھنی چاہئے ان کی نظر میں سیاست کا مفہوم بہت ہی عمیق و وسیع ہے۔آپ کے نزدیک سیاست سے مراد ہدایت و رہبری، تدبیر امور، اور دونوں جہاں میں انسان کی سعادت و خوشبختی کے لئے سامان فراہم کرنا ہے۔ علی (ع) کی نظر میں سیاست کا معنی ہرگز تجبر، زور گوئی اور قدرت کے بل بوتے پر دوسروں پر مسلط ہونا نہیں۔ علیؑ نیک اور درست سیاست کو انسان کے لئے مایہ حیات سمجھتے ہیں۔ایک جگہ آپ ع فرماتے ہیں " حسن السیاسة قوام الرّعیه " اچھی سیاست شہروں کو محکم بنادیتی ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں " حسن السیاسة یستدیم الریاسة" حسن تدبیر سیاست اور سرداری کو باقی رکھتے ہیں۔ تیسری جگہ فرماتے ہیں " من حسنت سیاسته دامت ریاسته " جس کی حکمت عملی اچھی ہوگی اس کی ریاست اچھی ہوگی۔آپ کی منطق میں مادی طاقت یا قدرت کے زور سے سیاست دان بن کر لوگوں میں سیاست کرنا، ایک لغو و بے ہودہ کام ہے۔آپ کے مطابق سیاست کی بنیاد عدل وانصاف، امنیت، سکون وراحت، ہر ایک کے حقوق کا پابند، مناسب موقع پر مناسب حکمت عملی اور مظلوم کی حمایت کرتے ہوئے ظالم کی مخالفت کرنا ہے۔آپ (ع) کی سیاست , فطرت انسانی، اور عقل سلیم کے عین مطابق ہے۔امام علیؑ نے سیاست کے اصول اور قوانین بھی بیان فرمائے ہیں جنہیں مالک اشتر کے نام لکھے ہوئے آپ کے خط میں دیکھے جاسکتے ہیں۔اس مکتوب کو اقوام متحدہ نے اپنے چارٹر میں شامل کیا ہے۔

## نتیجہ گیری

تعلیم وتربیت دونوں انسان کی دین اوآخرت کی سعادت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں تربیت کا مقبول عام مفہوم انسان کی ذاتی استعداد کو شکوفا کرکے مرحلہ قوہ سے مرحلہ فعلیت تک پہنچانا ہے، جس کا عمدہ ہدف انسان کی برجستہ استعداد کو کشف کرکے اسے معاشرے کاایک ذمہ دار فرد بنانا ہے، واضح سی بات ہے کہ اس ہدف تک رسائی انسان کی درست تصویر کشی اور اس کے اوصاف کی شناخت کے بغیر بہت مشکل ہے-اس اعتبار سے ہم پورے وثوق سے یہ کہ سکتے ہیں کہ تربیتی نظام میں انسان کی توصیف سنگ بنیاد کی منزلت پر ہے، کیونکہ تربیتی نظام کے سارے اجزاء یعنی مفاہیم ،اہداف اور اصول وروش خود انسان کے اوضاع وحالات سے مربوط ہوتے ہیں مثلا" انسان کو کونسے مقصد کی جانب راہنمائی کرنی چاہئے ؟اس راستے میں انسان کی حرکت کیسی ہو؟اسے کن طریقوں سے متحرک رکھنا چاہئے ؟اسے کن کن مراحل اور منازل سے عبور کرنا چاہئے وغیرہ، یہ سب اس چیز سے مربوط ہیں کہ انسان کیسا موجود ہے؟وہ کس طرح کے وجود کا حامل ہے ؟آج ہمارے اکثر تعلیمی درسگاہوں میں رائج نظام تعلیم وتربیت کا غائرانہ مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت کو سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ اس تعلیمی سسٹم میں بہت سارے نقائص پائے جاتے ہیں، جن میں سے بہت بڑی خامی یہ ہے کہ طالب علموں کو بالکل غیر محسوس انداز میں خدااور احکام خداوندی سے دور کرنے والے افکار کی تعلیم اس کا حصہ ہے، وہ نظام تعلیم شرم وحیااور حجاب کو روشن خیالی کا منافی قرار دے کر بے پردگی اور فحاشیت سے جینے کی تلقین کرتا ہے، اسلامی تعلیمات کو دقیانوسی قرار دے کر نونہالوں کو مادی لزتوں میں غرق رہنے کی تاکید کرتا ہے، مذہبی اور دینی انسانیت ساز معارف کو قصہ پارینہ قرار دے کر سائنسی معلومات حاصل کرنے کو ہی سعادت انسان کا حقیقی سبب ہونے پر دانش آموزوں کو باور کراتا ہے-جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے-ہمارے اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں مغربی نظام تعلیم وتربیت کا راج ہے, جس میں خدا کی بجائے مادے کو محوریت حاصل ہے، یہ تعلیمی نظام طالب علموں کے ذہنوں میں جسمانی منافع اور ضروریات سے مربوط خیالات کو تقویت فراہم کرنے کی توسکت رکھتا ہے لیکن معنوی اور روحانی ضروریات مضبوط کرنے کی توانائی نہیں رکھتا، بلکہ معنویات سے دور کرنے والی طرز فکر وہ ان کے ذہنوں میں راسخ کردیتا ہے-ہماری درسگاہوں میں ترجیحی بنیاد پر طالب علموں کو عقائد، احکام اور اخلاقی باتوں پر مشتمل کوئی کتاب نہیں پڑھائی جاتی، جس کے باعث ان میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے ذہنوں میں اسلامی معلومات کی کمی رہ جانا بدیہی اور واضح ہے-جب کہ ایک مسلم طالب علم کے لئے مسلمان ہونے کے ناتے دین کے بنیادی مسائل سے آگاہ ہونا ضروری ہے-مغرب کی اندھی تقلید اور پیروی کرتے ہوئے ہماری تعلیمی درسگاہوں میں بچوں کو تعلیم وتربیت دینے کا چلن عام ہوگیا ہے-یہی وجہ ہے کہ ان میں پڑھنے والوں کی اکثریت, اسلامی اور انسانی اقدار واصولوں سے ناآشنا ہوتی ہے، بلکہ بہت سارے تومذہب اور دین سے بیزار ہوتے ہیں، وہ واجبات ومحرمات الٰہی اور حلال حرام پر مبنی احکام سے روگردانی کرنے میں ہی اپنی عافیت تلاش کرتے ہیں، یوں اندھی تقلید میں تعلیم کے نام سے وہ کچھ خشک اصطلاحات اور فارمولے یاد

کر لیتے ہیں، وہ اسی کو اپنی زندگی کا اصلی سرمایہ قرار دیتے ہیں اور حقائق سے دور ہو کر دنیا کے کسی کونے میں اپنی دو روزہ زندگی جہالت تلے اندھیرے میں گزار دیتے ہیں -وہ اقدار اسلامی سے نابلد ہونے کی وجہ سے نہ اپنی حقیقت پہچان پاتے ہیں اور نہ اپنے خالق کی معرفت-

جب کہ انسان بڑی قیمتی مخلوق ہے, اس کی زندگی کا ہدف بہت بلند ہے، مگر اسلامی تعلیمات سے غافل ہونے کی وجہ سے آج کے انسانوں کی اکثریت کو نہ انسان کی قدر و منزلت کا ادراک ہے اور نہ ہی انسانی زندگی کے ہدف کی شناخت--

# منابع و مآخذ


۱) قرآن کریم

۲) نہج البلاغہ

۳) آثار شھید مرتضی مطہری

۴) تعلیم وتربیت کے وزیر، ان کے معاونین اور ڈائریکٹرز جنرل کے ساتھ ملاقات کے موقع پر رہبر معظم انقلاب کا خطاب (۱۹۹۲/۱/۱۵)

۵) ٹیچروں کے ساتھ ملاقات کے موقع پر رہبر معظم کا خطاب (۲۰۲۲/۵/۱۱)

۶) کتاب تعلیم وتربیت کی اہمیت اور ضرورت چاپ مشھد/ مؤلف : محمد حسن جمالی

۷) کتاب شناخت در قرآن کا اردو ترجمہ چاپ مشھد/ مؤلف : آیت اللہ جوادی آملی/ مترجم : محمد حسن جمالی

۸) طلال بن علی متی احمد، مادہ اصول التربیہ الاسلامیہ، مکہ مکرمہ، جامعہ امُ القری، الکلیہ الجامیہ، ۱۴۳۱ھ، ص ۸

۹) معجم مقاییس اللغۃ ص ۸۷ ۳، لسان العرب، ج ۲ ص ۱۴۲۰، مجمع البحرین ج ۲، ص ۶۳

۱۰) حسن مصطفوی، التحقیق فی کلمات القرآن، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۳۰ق، ج ۴، ص ۲۰

۱۱) مرتضی مطہری، تعلیم وتربیت در اسلام، تہران: صدرا، ۱۳۷۳ش، ص ۴۳

۱۲) راغب اصفہانی، مادہ ف ط ر

۱۳) ابن اثیر، الفطر: الابتداء والاختراع۔ النھایہ ج ۳ ص ۴۵۷

۱۴) استفادہ از مجلات، روز نامہ اردو و فارسی